تبصرہ کتب

تقلید کی شرعی حیثیت: محمد تقی عثمانی۔ شائع کردہ مکتبہ دار العلوم کراچی نمبر ۱۴
صفحات ۱۶۰ - قیمت ۶ روپے -

زیر تبصرہ کتاب ابتداءً ماہنامہ فاران (مئی ۱۹۷۳ء) میں ایک مقالہ کی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ قارئین کے نقد و تبصرہ کے بعد مصنف نے نظر ثانی کے بعد اس مقالہ کو دوبارہ کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب کی تالیف کا مقصد مصنف کے الفاظ میں یہ ہے: "یہ کوئی بحث و مناظرہ کی کتاب نہیں، بلکہ یہ مسئلہ تقلید کی علمی تحقیق ہے اور اس کا مقصد امت مسلمہ کی اس عظیم اکثریت کا مؤقف واضح کرنا ہے جو تقریباً ہر دور میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کرتی آئی ہے" (ص ۷)۔ فاضل مؤلف نے اس کتاب کو ایک غیر جانبدار عالم کی حیثیت سے نہیں بلکہ تقلید کے ایک زبردست حامی و وکیل کی حیثیت سے لکھا ہے۔ اور کتاب کے آخر میں منکرین تقلید کے اعتراضات کا علمی انداز میں جواب دیا ہے۔ اس کتاب میں تقلید کے تقریباً جملہ پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، چند اہم عنوانات یہ ہیں۔ حقیقت تقلید۔ قرآن کریم و تقلید۔ تقلید و حدیث۔ عہد صحابہ و تقلید مطلق۔ تقلید شخصی عہد صحابہ و تابعین میں۔ تقلید شخصی کی ضرورت۔ تقلید کے مختلف درجات، عوام۔ متبحر عالم۔ مجتہد فی المذہب۔ مجتہد مطلق۔ تقلید پر شبہات و اعتراضات۔ تقلید میں جمود۔

کتاب میں ہمیں تقلید کی مندرجہ ذیل تعریفات ملتی ہیں:

۱۔ اپنے فہم پر اعتماد کرنے کے بجائے قرآن و سنت کے کسی حکم کی جو تعبیر اسلاف میں سے کسی عالم نے کی ہو اس کو اختیار کرنا۔ (ص ۱۰)

۲۔ جس کا قول ماخذ شریعت میں سے نہ ہو اس کے قول پر دلیل کا مطالبہ کئے بغیر عمل کرنا (ص ۱۴)

۳۔ علم نہ رکھنے والوں کا اہل علم کی طرف رجوع کرنا (ص ۲۵)

۴۔ لوگوں کا علماء سے شرعی مسائل پوچھنا، ان کا حکم بتانا اور لوگوں کا اس پر عمل کرنا (ص ۲۸)

۵۔ قرآن و سنت کی صحیح مراد سمجھنے کے لئے اہل علم کی طرف رجوع کرنا (ص ۳۰)

۶۔ کسی عالم کے قیاس و اجتہاد پر اور علم و فہم پر بلا دلیل پوچھے اعتماد کرنا (ص ۳۵-۳۶)

مندرجہ بالا تعریفات اتنی عام ہیں کہ تقلید کے موجودہ جامد تصور پر ان کا اطلاق مشکل ہی سے ہوتا ہے اگر معاملہ صرف علماء سے احکام دریافت کرکے عمل کرنے کا ہوتا تو بات بہت آسان تھی۔ لوگ علماء سے شرعی حکم دریافت کرکے ان پر عمل کر لیتے۔ تقلید کی ابتداء تقلید مطلق سے ہوئی۔ اس کے بعد تقلید شخصی نے اس کی جگہ لے لی۔ ان میں بھی ائمہ اربعہ ہی تقلید کے قابل قرار دیئے گئے۔ ان سے پہلے یا ان کے زمانہ میں جن علماء نے اجتہاد کیا، لیکن ان کے مذاہب آگے نہ چل سکے، اور اب ان کے صرف قول باقی ہیں، ان علماء کو اب قابل تقلید نہیں سمجھا جاتا۔ مزید یہ کہ علماء کو بھی صرف اجتہاد فی المذہب یا اجتہاد فی المسائل کی اجازت ہے۔ براہ راست قرآن وسنت سے انہیں بھی استنباط احکام کی اجازت نہیں ہے۔ اپنے امام کے دلائل سے واقفیت ضرور حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اپنے مسلک کا دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں دفاع کر سکتے ہیں۔ تقلید میں یہی وہ غلو ہے۔ جو امت میں فکری جمود پر منتج ہوا اور عوام تو دینی فہم سے عاری تھے ہی، علماء و خواص بھی جمود کا شکار ہو گئے۔ اور آہستہ آہستہ دینی فکر صرف اسلاف کی کتابوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔

تقلید ایک تاریخی حادثہ ہے۔ امت کے لئے اس کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کیونکہ تاریخی حوادث معاشرہ میں اپنا مقام خود پیدا کرتے ہیں۔ تقلید نے بھی اپنا مقام خود بنایا۔ اس کے بعد ہی اس کے اثبات میں قرآن وسنت سے دلائل فراہم کئے گئے، جن کی حیثیت نکات بعد الوقوع کی ہے۔ دور تقلید میں علم و تحقیق میں اسلاف کی طرح انتھک محنت، وسیع مطالعہ، آزادئ رائے، وسعت قلبی، رواداری، خود اعتمادی اور شخصی ذمہ داری کے فقدان نے تقلید کے لئے زبردست وجہ جواز فراہم کر دی۔

زیر تبصرہ کتاب میں نقلی دلائل تو بے شمار ہیں، ہم یہاں صرف ایک عقلی دلیل نقل کرتے ہیں:

"علم و فہم، ذکاوت و حافظہ، دین و دیانت، تقویٰ و پرہیزگاری، ہر اعتبار سے ہم اس قدر تہی دست ہیں کہ قرون اولیٰ کے علماء سے ہمیں کوئی نسبت نہیں۔ پھر جس مبارک ماحول میں قرآن کریم نازل ہوا تھا قرون اولیٰ کے علماء اس سے بھی قریب ہیں۔ اور اس قرب کی بنا پر ان کے لئے قرآن وسنت کی مراد کو سمجھنا زیادہ آسان ہے۔ اس کے برخلاف ہم عہد رسالت کے اتنے عرصہ بعد پیدا ہوئے ہیں کہ ہمارے لئے قرآن و حدیث کا مکمل پس منظر، اس کے نزول کے ماحول، اس زمانہ کی طرز معاشرت، اور طرز گفتگو کا ہوبہو اور بعینہ تصور بڑا مشکل ہے۔ حالانکہ کسی بات کو سمجھنے کے لئے ان تمام باتوں کی پوری واقفیت انتہائی ضروری ہے"۔ (ص ۱۰)۔

ہر دور میں عوام کو بلاشبہ تقلید سے چھٹکارا نہیں۔ قرآن و سنت سے براہ راست ناواقفیت کی بنا پر شرعی احکام جاننے کے لئے کسی نہ کسی عالم پر انہیں اعتماد کرنا ہوگا۔ اور اس اعتماد میں انہیں احکام کے دلائل معلوم کرنے کی بھی ضرورت نہیں، کیونکہ ان دلائل کو سمجھنے کی صلاحیت عام طور پر عوام میں کم ہی پائی جاتی ہے۔ مسئلہ درحقیقت علمائے کبار کا ہے۔ ان کو بھی قرآن و سنت سے براہ راست استنباط احکام کی اجازت نہ دینا تقلید کا کارنامہ ہے۔ اور یہ سوال ہر دور میں ذہنوں میں ابھرتا رہا۔ اسی لئے مخالفین نے تقلید پر شدید اعتراضات کئے جو دراصل جمود و غلو کا ردعمل تھا۔ تعجب ہے کہ صحابہ اور ائمہ مجتہدین تو اجتہاد کی بنا پر اختلاف رائے سے گمراہ نہیں ہوئے۔ دور تقلید کے علماء آخر اختلاف رائے سے کیسے گمراہ ہو جائیں گے؟ جہاں تک علم کا سوال ہے، ہمارے دور میں علم سینہ بیشک قلیل ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں علم سفینہ دورِ قدیم سے کہیں زیادہ ہے۔ احادیث کا جو ذخیرہ ہمارے دور میں یکجا مل جاتا ہے، دورِ قدیم میں اس کے مواقع نہ تھے۔ علم و تحقیق کی جو سہولتیں دورِ حاضر میں میسر ہیں وہ پہلے نہ تھیں۔ جہاں تک تقویٰ کا تعلق ہے، تابعین اور ان کے بعد کے لوگ صحابہ کے تقویٰ کو نہیں پہنچ سکتے تھے، اس کے باوجود انہوں نے اجتہاد کی ذمہ داری قبول کی۔ اگر اجتہاد کے لئے تقویٰ ہی شرط ہے، عصمت نہیں، تو پھر دورِ تقلید کے علماء بھی تقویٰ سے خالی نہیں۔

تقلید کے اثبات میں فاضل مصنف نے قرآن مجید کی متعدد آیات اور احادیث پیش کی ہیں۔ اور اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ تقلید کے موجودہ تصور کا آغاز عہد نبوی سے ہوتا ہے۔ مصنف نے قرآن مجید کی جن آیات کو تقلید کی تائید میں پیش کیا ہے، ظاہر ہے ان کا زیرِ بحث مسئلہ تقلید سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ تاہم انہوں نے العبرۃ بعموم اللفظ لا بخصوص المورد کا سہارا لے کر تقلید کو قرآن مجید سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ قرآن و حدیث کی نصوص اگر تقلید کے جواز میں اس کی شرعی حیثیت کا مقام دلانے کے لئے پیش کی جا سکتی ہیں، تو منکرین تقلید کو بھی تقلید کے خلاف مفید مطلب آیات و احادیث سے استدلال کا حق ہونا چاہیئے۔ ابن حزم، ابن قیم، قاضی شوکانی وغیرہ علماء اپنے اپنے دور میں تقلید کے خلاف قرآن و سنت سے دلائل دے چکے ہیں۔ تقلید کی تائید میں دلائل کو ماننا، اور اس کے خلاف دلائل کو نہ ماننا ستم ظریفی ہے۔ اس صورت میں قرآن و سنت سے تقلید کا جواز و عدم جواز دونوں ہی ثابت ہوتے ہیں۔ جب نصوص ایک چیز کے لئے وارد ہی نہیں ہوئیں تو عمومی الفاظ سے جو بھی مفہوم

آپ چاہیں نکال لیں۔ بہرحال یہ بات واضح ہے کہ قرآن و سنت سے تقلید کے موافق یا مخالف استدلال کی حیثیت محض معروضی ہے۔ اور ذاتی رائے کا اس میں زیادہ عمل دخل ہے۔

یہ بات بظاہر صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ تقلید کا موجودہ تصور عہد نبوی و عہد صحابہ میں موجود تھا۔ فاضل مصنف نے تقلید کے لفظ کو کچھ زیادہ ہی وسیع معنوں میں لے کر ہر دور پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ صحابہ کا ایک دوسرے سے مسائل پوچھنا، بغیر دلیل طلب کئے ہوئے ایک دوسرے کی بات مان لینا، عہد نبوی میں صحابہ کا تعلیم احکام دین کے لئے دوسرے شہروں میں جانا، اور اس شہر کے باشندوں کا کسی صحابی کی تعلیم پر اعتماد کر کے عمل کرنا، ان سب واقعات کا زیر بحث تقلید سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ناواقف کا واقف سے پوچھنا ہر دور میں رہا ہے، اور اس کو کوئی شخص بھی تقلید نہیں کہتا۔ صدر اسلام کے دینی و بالخصوص فقہی ادب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تقلید کی ابتداء دوسری صدی ہجری کے نصف آخر سے ہوئی۔ اور تیسری صدی میں اس نے بتدریج تقلید شخصی کی شکل اختیار کر لی۔ اور اس کے بعد اس کو باقاعدہ شرعی حیثیت دے کر اس کے اصول و ضوابط بنائے گئے۔

فاضل مصنف نے حدیث "فاقتدوا بالذین من بعدی" میں لفظ اقتداء کے بارے میں لکھا ہے: "حدیث میں لفظ اقتداء استعمال کیا گیا ہے، جو انتظامی امور میں کسی کی اطاعت کے لئے نہیں بلکہ دینی امور میں کسی کی پیروی کے لئے استعمال ہوتا ہے"۔ اس کے بعد اس خیال کی تائید میں انھوں نے لسان العرب سے عربی کا یہ جملہ نقل فرمایا ہے: "القُدوۃ والقِدوۃ ما تسننت بہ" قدوہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی سنت پر تم عمل کرو۔ (ص ۲۶)۔ مصنف کا یہ استدلال محل نظر ہے۔ ابن منظور نے یہ کہیں نہیں کہا کہ سنت یا اقتداء صرف دینی امور میں استعمال ہوتے ہیں، انتظامی امور میں نہیں۔ عربی زبان میں یہ دونوں لفظ دینی و انتظامی یا دنیوی امور میں مستعمل ہیں۔ اس لئے اقتداء کو صرف دینی امور کے لئے خاص کرنا عربی لغت کے ساتھ ناانصافی ہے۔ یوں بھی الفاظ کے معنی عام طور پر سیاق و سباق ہی سے سمجھے جاتے ہیں۔ اقتداء کا لفظ کسی جگہ اگر دینی امور کے سیاق میں مستعمل بھی ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ لفظ دوسرے معنی میں استعمال ہی نہیں ہوتا۔ مصنف کا فرض تھا کہ وہ اطاعت، اتباع، تقلید، اور اقتداء جیسے الفاظ پر تفصیل سے گفتگو کرتے، اور ان کے درمیان فرق بتلاتے۔

[illegible]

ہیں۔ ان میں ایک مشہور حدیث حضرت معاذ بن جبل کی بھی ہے، جس میں قرآن و سنت میں حکم نہ ملنے کی صورت میں اپنے قیاس و اجتہاد سے استنباط حکم کی طرف اشارہ کیا تھا۔ مصنف فرماتے ہیں: "اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ آپ نے اہل یمن کو ان کی تقلید شخصی کی اجازت دی ہے۔ بلکہ اس کو ان کے لئے لازم فرما دیا"۔ (ص ۵۰) مصنف نے حاشیہ میں اس حدیث پر اعتراضات کا جواب دیا ہے اور ابن قیم کے حوالہ سے وہ اس کی سند کو متصل اور اس کے رجال کو معروف و ثقہ کہتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ معاذ بن جبل کی یہ حدیث محدثین کے درمیان مختلف فیہ رہی ہے۔ ایک گروہ اس کی صحت کا قائل ہے، دوسرا فریق اسے ضعیف قرار دیتا ہے۔ ابن حزم نے بھی الاحکام فی اصول الاحکام میں اس پر شدید تنقید کی ہے۔ تاہم مصنف نے امت کے درمیان قبول عام کی بنا پر اس سے استدلال کیا ہے۔ ابن قیم اپنی کتاب تہذیب شرح سنن ابی داؤد میں حضرت معاذ کی اس روایت کو ترجیح دیتے ہیں جو سنن ابن ماجہ میں ان الفاظ کے ساتھ مذکور ہے: معاذ بن جبل قال: لما بعثنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی الیمن قال: لاتقضین ولا تفصلن الا بما تعلم، وان اشکل علیك امر فقف حتی تبینہ او تکتب الی فیہ۔ اس کے بعد ابن قیم لکھتے ہیں: وھذا اجود اسنادا من الاول، ولا ذکر فیہ للرأی۔ یعنی اس روایت کی سند پہلی روایت کی سند سے زیادہ جید ہے۔ اور اس میں رائے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ (تہذیب شرح سنن ابی داؤد۔ ج ۵۔ ص ۲۱۲)۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو اہل یمن کے پاس احکام دین کی تعلیم کے لئے بھیجا تھا۔ وہاں کے لوگ اگر سارے علماء ہوتے تو حضرت معاذ کو بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا مصنف ایک استاد پر طالب العلم کے اعتماد کو بھی تقلید ہی کہیں گے؟ نیز یہ واضح رہے کہ قول صحابی کی حجیت کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ جن کے نزدیک قول صحابی حجت ہے، وہ حضرت معاذؓ یا دوسرے صحابہ کے اقوال پر عمل کو کیسے تقلید کہیں گے، کیونکہ تقلید ایسے شخص کی پیروی کو کہا جاتا ہے جس کا قول حجت نہ ہو۔

جمع بین الصلاتین کے بارے میں مصنف فرماتے ہیں: "بلکہ اس حدیث کو قرآن و سنت کے دوسرے دلائل کی روشنی میں صرف حنفیہ ہی نے نہیں، بلکہ شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ اور اہلحدیث حضرات نے بھی جمع صوری کے معنی پر محمول کیا ہے" (ص ۹۱)۔ حنفیہ کے بارے میں کہنا تو درست ہے کہ وہ جمع صوری (یعنی جمع فعلی) کے قائل ہیں۔ لیکن باقی تینوں ائمہ کی طرف جمع صوری کی نسبت درست نہیں ہے۔ وہ

جمع تقدیم، اور جمع تاخیر (یعنی جمع حقیقی) کے قائل ہیں۔ ان کے درمیان اختلاف صرف عذر و سبب میں ہے۔ (معارف السنن، ج ۲۔ ص ۱۶۱)۔ بلکہ ابن تیمیہ نے ظاہر حدیث پر عمل کرتے ہوئے گھر میں (غیر سفر) جمع بین الصلاتین کو اس لئے جائز کہا ہے کہ امت تنگی میں نہ پڑے، جیسا کہ ابن عباس کا خیال تھا، اور جس کو مرض پر محمول کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر انہوں نے ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو۔ ابن تیمیہ۔ مجموعۃ الرسائل والمسائل۔ ج ۲۔ ص ۴۱)۔

کتاب کے آخر میں فاضل مصنف نے تقلید میں جمود کے عنوان سے ایک فصل قائم کی ہے۔ اور اس میں تقلید میں جمود و غلو کو قابل مذمت بتایا ہے۔ اور اس کی جو صورتیں بھی ہو سکتی ہیں ان کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ اس طرح مصنف اپنے نقطہ نظر میں اعتدال و توازن قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے، اور انتہاپسندی سے بچ گئے۔

یہ کتاب اپنے موضوع پر بڑی جامع ہے۔ تقلید کے بارے میں جو شکوک و شبہات۔ اور الجھنیں ذہن میں پیدا ہوتی ہیں ان کے ازالہ کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے یہ کتاب لکھ کر ایک علمی و دینی خدمت انجام دی ہے

احمد حسن

****